مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن سے متعلق ایک بحث

تذکیر بایام اللہ

جس طرح انسان کو حضرت حق سے روشناس کرانے کا ایک اسلوب قرآن حکیم نے یہ اختیار کیا ہے کہ اس کے قلب و باطن پر مرتسم و پنہاں جذبۂ شکر و سپاس میں تحریک پیدا کی جائے اور اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات بے پایاں نے کیونکر اس کا احاطہ کر رکھا ہے اور کس کس طریق اور ڈھنگ سے عنایت الٰہی کی ارزانیاں اس پر اثر انداز ہیں۔ ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم نے اس کی اصلاح کے لیے ایک اسلوب تحذیر و تخویف کا بھی اختیار کیا ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ گزشتہ اشخاص اور قوموں کے حالات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ ان سے عبرت پذیری کے مقامات اور پہلوؤں کی نشاندہی ہو سکے۔ ان قصص و واقعات کی تفصیل کے سلسلہ میں قرآن حکیم نے دو اہم اور حکیمانہ نکتوں کو خصوصیت سے ملحوظ و مرعی رکھا ہے۔

(۱) یہ کہ قصص میں سے صرف انہی واقعات و احوال کو منتخب کیا جائے جو جزیرۃ العرب میں رونما ہوئے یا جو اُن کے ہاں جانے بوجھے اور مسلمہ حیثیت کے حامل تھے۔ قرآن نے ان حالات کو بیان نہیں کیا جن سے ان کے کان آشنا نہ تھے۔ یعنی جن کو نہ تو انبیائے سابقین نے بیان کیا تھا۔ اور نہ جن کی تصریح ان لوگوں سے منقول تھی، وعظ اور قصہ گوئی جن کا پیشہ تھا۔

(۲) قرآن حکیم اگرچہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے دنیا کے سامنے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا صحیح ذوق تصور پیش کیا اور یہ فخر بجا طور پر مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے تاریخ کو استناد کی راہ پر ڈالا اور اس انداز سے ترتیب دیا کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ تاہم اس کتاب ہدیٰ کا اصل موضوع تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل موضوع یہ ہے کہ اقوام و ملل اور اشخاص و افراد کے بارے میں صرف انہی گوشوں کو بے نقاب کیا جائے جن میں عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کا کوئی نہ کوئی اشارہ پایا جاتا ہے یا جس سے کسی نہ کسی غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے اور واقعہ کی نئی تعبیر فکر و نظر

کے سامنے آتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات پر سیاق و سباق کی مختلف مناسبتوں کے پیشِ نظر جن واقعات و قصص پر روشنی ڈالی وہ یہ ہیں :

(۱) تخلیق آدم : فرشتوں کا احترامِ آدمیت کے پیشِ نظر آدم کو سجدہ کرنا، شیطان کا انکار اور اس کے نتائج۔

(۲) حضرت موسیٰ اور فرعون کے ساتھیوں کے درمیان پیش آنے والے واقعات۔ فرعون اور اس کے بندوں کی طرف سے ایذا رسانی کی مختلف صورتیں اور نصرتِ الٰہی کی ارزانیاں۔

(۳) حضرت داؤد اور جناب سلیمان علیہم السلام کی بزرگی و عظمت کے پہلو۔

(۴) حضرت ایوب کا صبر و تحمل

(۵) حضرت یونس کا آزمائش میں ثابت قدم رہنا۔

(۶) حضرت ادریس کا تذکرہ

(۷) حضرت ابراہیم اور نمرود کا مناظرہ، ان کا بت پرستانہ ماحول کے خلاف جہاد اور عقیدۂ توحید کا برملا اعلان۔

(۸) حضرت یوسف، انسانی فطرت کی تشریح اور اس دَور کے مصری معاشرہ کا تجزیہ۔

(۹) اصحابِ کہف کے بارہ میں بعض اہم تفصیلات۔

(۱۰) اصحابِ فیل، انہدامِ کعبہ کا قصہ اور اس کا عبرت ناک انجام۔

تذکیر بایام اللہ سے متعلق ایک اہم بحث یہ ہے کہ آیا قرآن تاریخ کے عمل میں کسی معنویت کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، یعنی اگر اس کتابِ ہدیٰ کا مقصد ان قصص و واقعات کو ذکر کرنے سے مقاماتِ عبرت پذیری کی نشاندہی ہی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس عبرت پذیری کا تعلق کسی علمی اساس یا اجتماعی و اخلاقی پیمانہ سے ہے۔ یا یہ حوادث محض اتفاق و مصادفہ کا کرشمہ ہیں اور ان کے پیچھے کسی نوع کا علمی و اخلاقی اصولِ تعلیل کارفرما نہیں۔ اس موضوع پر کچھ کھل کر کہنے سے پہلے قصص و اخبار کے سلسلہ میں ہم قرآنِ حکیم کی اس ادائے خاص کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے جہاں انبیا علیہم السلام کی دعوت، تحریک اور اس جد و جہد کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اشاعت حق کی

خاطر اختیار کی، وہاں خصوصیت سے اپنے حریفوں کا نام بھی لیا ہے اور ان کی ان مساعی تردید و انکار پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے اشاعت و تبلیغ حق کے مشن کو نقصان پہنچا۔ لیکن اس تعصب، عناد اور تنگ نظری کو دیکھیے کہ آثارِ قدیمہ کی بدولت عرب کی جن عظیم تاریخی شخصیتوں کے بارہ میں معلومات حاصل ہو سکیں، یہ سب اپنے اپنے دور میں انبیا علیہم السلام کے حریف اور دشمن رہے ہیں۔ مگر مجال ہے کہ ان کی تحریروں اور نوشتوں میں کہیں ہلکا سا اشارہ بھی ایسا پایا جائے، جن سے انبیا کی دعوت و پیغام کا کوئی گوشہ واضح ہو سکے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ اظہارِ حق کے معاملہ میں نہ صرف کسی بخل سے کام نہیں لیتا بلکہ بغیر کسی مصلحت کیشی کے وضاحت و تفصیل کے ساتھ اپنے حریفوں اور دشمنوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔

تاریخی عمل کی نوعیت کیا ہے، یہ اپنی آغوش میں کس نوع کی معنویت کو لیے ہوئے ہے؟ یہ مسئلہ فلسفہ تاریخ کی رو سے اہل نظر کے ہاں شدید اختلافات کا حامل ہے۔ کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ تاریخی عمل سرے سے کسی بندھے ٹکے قاعدہ یا ضابطہ کا پابند ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق چونکہ مختلف قوموں اور گونا گوں تہذیبی دائروں سے ہے، لہٰذا خذ نتائج کے معاملہ میں کسی ایک اصول پر کاربند نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ حضرات نے تاریخ میں اس معنویت کی نشاندہی کی ہے کہ بہرحال اس امر کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ اس نے بے شمار انقلابات و تغیرات کا سامنا کیا ہے۔ یعنی ماضی میں متعدد قومیں معمورۂ ارض پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی ہیں اور بالآخر تباہی اور زوال کے افق تاریک میں غائب ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن ان کے مٹنے سے تاریخ کا عمل بے کار نہیں ہوا، اس کے برعکس یہ نئی شان اور نئی پھبن اور سج دھج کے ساتھ آگے بڑھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک تہذیب اگر ختم ہوئی ہے تو اسی کی کوکھ سے دوسری تہذیب نے جنم لیا ہے جو اس سے زیادہ توانا اور صحت مند ثابت ہوئی۔ ہیگل نے تاریخ کے اس ارتقا کو تصوریت کا رہین منت قرار دیا اور مارکس نے مادیت کو۔ اور دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ارتقا و تقدم کا عمل دعویٰ، جواب دعویٰ اور ترتیب و امتزاج کے سہ گونہ خانوں میں مضمر ہے۔ ہیگل اور مارکس میں کون حق بجانب ہے یا کیا اس تثلیث سے کائنات کے ہمہ جہت ارتقا کی پوری طرح تشریح قابل فہم ہے۔ اس بحث کا یہ محل نہیں۔ ہم تذکیر "بایام اللہ" کی وضاحت و تفصیل کے ضمن میں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس مسئلہ پر

ں پہلو سے روشنی ڈالی ہے اس کا تعلق قوموں کے عروج و زوال یا بقا و فنا کے مسائل سے ہے۔
رآن حکیم کے نقطۂ نظر سے اس عالم کی آفرینش اور ارتقا کے پیچھے چونکہ وہ مبدا اخلاق کارفرما ہے
خود قدر الاقدار یا جمال و کمال کا افق اعلیٰ ہے، اس لیے قوموں کے ارتقا و بقا کا مسئلہ کسی نہج
صرف مادی نوعیت کا نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ایجادات
ے تہذیب حاضر نے انتہائی عروج حاصل کر لیا ہے اور بظاہر تحفظ و دفاع کے ان تمام تقاضوں
پورا کر دیا ہے جو کسی بھی قوم کے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ بظاہر
یاسی اور اقتصادی تنظیموں نے استحکام و استواری کے اس بام تک رسائی حاصل کر لی ہے کہ
ں کسی باشعور معاشرہ کا صفحۂ وجود سے مٹ جانا مشکل نظر آتا ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ بقا و ارتقا
صل راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ کسی معاشرہ کی بنیاد کن اخلاقی و روحانی اصولوں پر قائم ہے۔
ں کے کردار و سیرت میں عقیدہ و ایمان کی کارفرمائیوں کا کس درجہ دخل ہے۔ یعنی کیا یہ معاشرہ
سی عقیدہ کا حامل ہے، انسانی دوستی پر یقین رکھتا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ مسرت و
ادمانی کے تمام خزائن میں ہر انسان کا حق ہے، یا یہ معاشرہ، گروہی، وطنی یا نسلی امتیازات کو
رجیح دیتا ہے یا کیا فرض شناسی، محنت اور محبت و ایثار کے جوہر اس میں پائے جاتے ہیں یا اس کی
طرت میں خود غرضی اور کاہلی داخل ہے اور یہ کہ کیا اوامر و نواہی کا کوئی نقشہ اس کے پیش نظر ہے۔
اس کے دائرۂ عمل کا تعین اس کی اپنی پسند اور خواہش کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری
خلاقی و انسانی قدریں ہیں جن کے بل پر کوئی قوم زندہ رہتی اور تقدم و ارتقا کی منزلیں طے کرتی
ہے، اور اگر کوئی قوم ان اخلاقی و روحانی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتی ہے تو مادی قوت اور
ساز و سامان اس کو کسی طرح بھی انحطاط و زوال کے خطرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ بقا و تعمیر کے
ان اخلاقی و روحانی اصولوں کو قرآن حکیم نے مثبت اور منفی دونوں انداز سے بیان فرمایا ہے:

والعصر ○ ان الانسان لفی خسر ○ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصلحٰت وتواصوا بالحق
وتواصوا بالصبر ○

سہ العصر

زمانہ کی قسم انسان گھاٹے میں ہے، سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور را
حق میں پیش آمدہ مصائب کی صورت میں برداشت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قد افلح المومنون، الذین ھم فی صلاتھم خاشعون، والذین ھم عن اللغو معرضون
والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون o والذین ھم لفروجھم حٰفظون o [۵۲]

بلاشبہ وہی لوگ کامرانی سے ہم کنار ہوئے جو نماز میں عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہیں۔ (اور) جو لغو باتوں سے
کنارہ کش رہتے ہیں۔ (اور) جو باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور مقامات لغزش سے اپنے کو بچائے رکھتے ہیں

قد افلح من تزکیٰ o و ذکر اسم ربہ فصلیٰ o [۵۳]

یقیناً وہی کامیاب ہوا جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز کا
پابند رہا۔

سورۂ عصر کی ان آیات میں زمانہ کو بطور گواہ کے پیش کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم تاریخ انسانی کی گرد
پر تحقیق نظر ڈالو اور دیدۂ عبرت پذیر سے دیکھنے کی کوشش کرو کہ انسان ایمان اور عمل صالح کے
اصولوں کو چھوڑ کر کن کن عمرانی، روحانی و اخلاقی محرومیوں سے دوچار ہوا۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ جب تک
کوئی قوم حق کی راہ پر گامزن رہی اور اس حق کو آئندہ نسلوں تک تعلیم و تربیت کے ذریعے پہنچاتی رہی
اور ان آزمائشوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہی جو اس راہ میں پیش آئیں۔ کامیابی اور کامرانی اس کا مقد
رہا اور جونہی یہ جادۂ مستقیم سے ہٹی اور روحانی و اخلاقی قدروں سے محروم ہوئی زوال و انحطاط
یا خسران اور گھاٹے کے تقاضوں نے اسے اپنی لپیٹ میں آلیا۔

سورۂ المومنون میں بقا و تعمیر کی ان قدروں کی نشاندہی کی گئی ہے جو کسی بھی معاشرہ کی فلاح و
کامیابی کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ یعنی ایمان، اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ اور نیازمندانہ تعلق خاطر، لغویات
سے احتراز، زکوٰۃ اور صدقات سے شغف و محبت اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے عہد و التزام۔

سورۂ الاعلیٰ میں اس بات کی تصریح ہے کہ کامیابی و کامرانی کے لیے قلب و نظر کا عفاف اور
پاکیزگی اور ہر مرحلہ میں پروردگار کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ زندگی، آداب بندگی

---

[۵۲] المومنون [۵۳] الاعلیٰ ۱۵

اور ارتقا کے کسی بھی مرحلہ میں اپنے آقا و مولا کو فراموش نہ کیا جائے۔ اس مثبت اسلوب کے پہلو بہ پہلو منفی انداز میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ انحطاط کا آغاز ہمیشہ کسی قوم کی نفسیات و عقائد کے بگاڑ سے ہوتا ہے۔ اور جب کسی قوم کے نفسیات و عقائد بگڑ جائیں اور اخلاقی و روحانی قدروں کو معاشرہ پس پشت ڈال دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی مادی طاقت اس کو تباہی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ خود عربوں نے دیکھا کہ جب رومی بگڑے اور عمالقہ و فراعنہ نے اللہ کی سرزمین پر کبر و غرور کا مظاہرہ کیا تو غیرت حق جوش میں آئی اور ان کے شان و شکوہ کو خاک میں ملا دیا گیا۔ اس وقت نہ دولت کی ریل پیل، نہ عسکری طاقت، اور نہ اونچے اونچے اور سر بہ فلک محلات اور مضبوط و مستحکم قلعہ بندیاں ہی ان کے کچھ کام آسکیں اور نہ اُن کے آلہہ اور بڑے بڑے مندر اور ہیکل ہی مکافات عمل کے منصفانہ قانون کی گرفت سے ان کو بچا سکے۔ ان کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور ان کے شہروں اور بستیوں کو اس طرح تہہ و بالا کر دیا گیا کہ دیدۂ عبرت ان سے سبق حاصل کر سکے۔

کداب آل فرعون والذین من قبلھم کفروا بآیات اللہ فاخذھم اللہ بذنوبھم ان اللہ قوی شدید ۝ ذالک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃً انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم وان اللہ سمیع علیم ۔[۵۴]

جیسا حال فرعونیوں اور ان سے پہلی قوموں کا ہوا تھا۔ انھوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ بے شک خدا قوی اور شدید ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جو نعمت اللہ کسی قوم کو عطا کرتا ہے، اس کو وہ اس وقت تک بدلنے والا نہیں، جب تک کہ خود یہ اپنے دلوں کی حالت کو نہ بدل لیں۔ اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا بوجھتا ہے۔

فکاین من قریۃ اھلکنٰھا وھی ظالمۃ فھی خاویۃ علی عروشھا و بئر معطلۃ وقصر مشید ۝ افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او آذان یسمعون بھا فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور[۵۵]

اور بہت سی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا، کیونکہ یہ نافرمان تھیں۔ سو وہ اپنی چھتوں پر گری

---

[۵۴] الانعام : ۵۲ [۵۵] الحج : ۴۶

پڑی ہیں۔ اور بہت سے کنوئیں بے کار ہو کر رہ گئے ہیں اور بہت سے محل اور ایوان زبانِ حال سے اپنی ویرانی پر مرثیہ خواں ہیں۔ کیا ان لوگوں نے ملک میں گھوم پھر کر ویرانی اور تباہی کے اسباب کا کھوج نہیں لگا تاکہ ان کے دل کچھ سمجھ سکتے، اور ان کے کان تباہی و بربادی کی اس چیخ پکار کو سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں جو سینوں میں دھڑک رہے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ تذکیر بایام اللہ کے ضمن میں قرآن حکیم نے تاریخ کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے دو واضح پہلو ہیں، ایک یہ کہ اگر تم صحت مند حال کی تعمیر و ارتقا کے خواہاں ہو تو ماضی سے متعلق تمہارے فکر و تدبر کا رشتہ منقطع نہیں ہونا چاہیے، دوسرے تمہیں دیکھتے رہنا چاہیے کہ بحیثیت مجموعی مختلف قوموں اور تہذیبوں نے تمہارے لیے فکر و نظر کا کیا اثاثہ چھوڑا ہے، کن قیمتی تجارب نے تمہیں مالا مال کیا ہے اور عمل و کردار کے وہ کون موڑ ہیں جن سے دامن کشاں رہنے کی ضرورت ہے۔ یعنی ماضی کے بارہ میں مطالعہ و تحقیق کے سلسلہ میں اس بات پر کڑی نگاہ رکھو کہ ان میں خیر، جمال اور نیکی کے کون کون عناصر کارفرما تھے۔ اور وہ کیا اسباب و دواعی تھے جن کی وجہ سے دنیا کی عظیم تہذیبیں مٹیں اور تباہ ہوئیں ___

جہاں تک قرآن حکیم کی تصریحات اور حکمتِ بالغہ کا تعلق ہے، اس نے اس سے قبل کہ تم مطالعہ تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچو، از راہِ ہمدردی پہلے سے اس حقیقت کو واشگاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ جب بھی کوئی معاشرہ ایمان و عقیدہ سے بہرہ مند ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ سے تعلق و وابستگی کے رشتوں کو استوار رکھے گا، اور جب بھی کوئی قوم ایمان کی روشنی میں اپنی نفسیات کی تعمیر کرے گی اور اس کے مطابق زندگی کا نقشہ ترتیب دے گی، اسی کی کامیابی کے امکانات روشن ہوں گے۔ اور جب ایمان کے رشتے سست ہونے لگیں اور اس کی جگہ مادیت کو فروغ ہو، ذاتی و گروہی مفاد کو ترجیح دی جائے اور خود غرضانہ یا فسق آفریں نظریات و تصورات رواج پا جائیں، سمجھ لیجئے انحطاط کا آغاز ہوا اور قوم نے زوال و ہلاکت کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔